

## اسلام کی حکمتِ تعلیم و تربیت

### سورہ لقمان کی روشنی میں

نعیم صدیقی

پورا قرآن نصیحت ہے، پورا قرآن انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے ہے اور پورے قرآن میں وہ اصول، مقاصد اور خطوط کار پھیلے ہوئے ہیں جن پر اسلامی معاشرے کا نظامِ تعلیم استوار ہونا چاہیے اور پھر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں قرآن کے منشا کے مطابق بچوں، بالغوں، عورتوں اور قائدین عوام کی تعلیم و تربیت کا جو ہمہ گیر نظام عملاً نافذ کیا اور عوام کی ذہنی و اخلاقی تعمیر کے لیے جن ادارات کے نقوشِ اولین قائم کیے، اس پورے کام کو - قرآن کے نکات کی اس جامع عملی توضیح و تفسیر کو - زیرِ غور لائے بغیر اسلام کی حکمتِ تعلیم کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس حکمت کے مطابق کوئی تعلیمی منصوبہ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ قرآن، اسوۂ رسالت اور قرآن کے مطابق برسرِ عمل آنے والے نظام کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ لے کر اسلامی حکمتِ تعلیم کو قلم بند کرنے کے لیے تو بڑا وقت درکار ہے۔ فی الوقت پیشِ نظریہ ہے کہ ہم اسلامی حکمتِ تعلیم کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

قرآن میں زندگی کے جو حقائق مذکور ہیں وہ ایک طرف تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں اور دوسری طرف بعض خاص مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں کسی ایک حقیقت کو اجمال اور جامعیت سے یک جا بیان کر دیا جاتا ہے۔ حکمتِ تعلیم و تربیت کی کاوش میں پڑ کر جب ہم قرآن کھولتے ہیں تو سورہ لقمان ہم سے خصوصی توجہ کا خراج وصول کرتی ہے۔ سورہ لقمان تمام تر نصیحت ہے اور از اول تا آخر حکمتِ تعلیم و تربیت کی

آئینہ دار! اسی سورہ کے مطالب پر ہم اپنے تعلیمی تصورات کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے فلسفہ تعلیم کی سورہ ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ گھروں میں ہم اولادوں کو کس نقشے پر اٹھائیں، درس گاہوں کا نظام کن بنیادوں پر کھڑا کریں اور کس ذہن و کردار کا انسان اپنے ہاں تعمیر کریں۔

## اسلام کا انسان مطلوب

آئیے! سب سے پہلے ہم اس سورہ کے آئینے میں اسلام کے انسان مطلوب کی ایک جھلک دیکھیں۔ سورہ کے دیباچے ہی میں انسانیت کے اس بہترین کردار کا ذکر موجود ہے جسے ظہور دینے کے لیے الہامی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں اور ان آیات میں جو ہدایت و رہنمائی ہے اور اس ہدایت و رہنمائی میں جو رحمت مضمر ہے وہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو احسان کیش ہوں۔ قرآن کا نظام فکر و عمل صرف محسنین کے ذریعے چل سکتا ہے اور یہ نظام اسی طرز کے قاندرین و کارکن مانگتا ہے (لقمان ۱-۳)۔ ان کے نقشہ زندگی کے چند اہم آثار بھی بیان کر دیے کہ:

وہ نماز قائم کرنے والے ہوں، وہ زکوٰۃ دینے والے ہوں، وہ

آخرت کو پیش نظر رکھنے والے ہوں۔ (۳:۳۱)

بیان کی نوعیت احاطہ و احصار کی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ ان ناگزیر

اوصاف کے بغیر احسان کیش کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی لوگ

ہیں جو اپنے رب کے دیے ہوئے نظام ہدایت پر چل سکتے ہیں اور

ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (۵:۳۱)

واضح رہے کہ محسن یا احسان کیش کا مفہوم اسلامی اصطلاح میں یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر خیال، عمل اور سرگرمی میں حسن و خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے اور اپنی ساری کی ساری داستان حسن اعتقاد اور حسن کردار سے آراستہ کرے۔ پھر بات انفرادی اور نجی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہمارا پورے کا پورا تمدنی نظام، اس کے

سارے شعبے اور ادارے اور ہماری جملہ اجتماعی سرگرمیاں حسین ترین پیرایہ رکھتی ہیں۔ یعنی اسلام حُسنِ فکر اور حُسنِ عمل کا ایک مکمل نظام مانگتا ہے۔ وہی چیز جسے دوسری جگہ حیاتِ طیبہ کہا گیا ہے۔ ایسے انسانی کردار اور ایسے نظامِ تمدن کے ذریعے ہی انسان کو فلاح حاصل ہوتی ہے۔ زندگی اپنے تقاضوں کو صحیح طور سے پورا کرتی ہے اور انسانیت اپنے فطری مقاصد تک پہنچتی ہے۔ فلاح! اس دنیا میں بھی اور فلاحِ آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں 'حیاتِ طیبہ' کا حصول بجائے خود فلاح کی آخری شکل ہے اور یہی حیاتِ طیبہ اُخروی فلاح کی ضامن ہوتی ہے۔ گویا ہمارے نظامِ تعلیم کا منہجا ایسے احسان کیش کرداروں کی تشکیل ہے جو نماز، زکوٰۃ اور فکرِ آخرت کے اوصاف کو بنیاد بنا کر حیاتِ طیبہ پیدا کریں اور اپنی ذات سے لے کر بڑے بڑے تمدنی ادارات تک ساری زندگی کو سنواریں۔

### مقابل کا فاسد کردار

قرآن کا اسلوب بالعموم اضداد کو مقابلہ دکھانے کا ہے۔ اب جہاں انسان مطلوب کا نقشہ بیان ہوا، وہاں نامطلوب کردار کی بھی ایک جھلک دکھانی لازم تھی۔ مطلوب کردار تو وہ ہے جو مسلکِ احسان کا متلاشی ہے، جو حیاتِ طیبہ کے حصول کے لیے مضطرب رہتا ہے، جو ہدایتِ رب کو جاننا چاہتا ہے، جو اس کی آیات کی روشنی کا پیاسا ہے جو فلاح کی جستجو میں ہے اور جس کے سامنے فوری مزے اور چسکے ہی نہیں ہیں بلکہ آخرت کے نتائج بھی ہیں۔

لیکن مقابل کا کردار وہ ہے جو 'لھوالحدیث' کا شائق ہے۔ بے مقصد اور لا حاصل قسم کے قصے کہانیوں سے اسے رغبت ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور اس کے مسائل سے بھاگ کر یادہ گوئی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ خود پناہ ڈھونڈتا ہو بلکہ وہ تفریحی ادب کے افسوں کو کام میں لا کر دوسروں کو بھی خدا کی راہ سے ہٹالے جانا چاہتا ہے۔ درآئحالیکہ اس کے پلے کچھ بھی علمِ حقیقت نہیں ہوتا۔ اپنی جہالت کی وجہ سے وہ خدا کی راہ اور خدا کی ہدایت کا مذاق اڑاتا ہے، وہ عظیم اور اٹل حقائق کو تسمخہ میں اڑا دینا چاہتا

ہے (۶:۳۱)۔ اس کے سامنے جب اللہ کی کتاب حکیم کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ اپنے نشہ پندار میں بہک کر اُن سے اس طرح روگردانی کرتا ہے گویا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ (۷:۳۱)

ہمیں اپنے نظام تعلیم کی حکمت متعین کرتے ہوئے خوب صراحت سے طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں اپنے ہاں اس طرز کے کردار کو پروان نہیں چڑھنے دینا ہے۔ خصوصاً علوم میں، ادب میں اور فنونِ لطیفہ میں ہمیں ان رجحانات کو نشو و نما نہیں دینی جن کا ماحصل لھو الحدیث ہو اور جن کی وجہ سے لھو الحدیث کا ذوق بڑھے۔ وہ تمام فضولیات جو فراریت پسندوں کی پناہ گاہ ہوں، جو راہِ حق سے ہٹانے والی ہوں، جو آیاتِ الہی کے لیے کانوں کو بہرہ کر دیں، جو خدا کے سامنے عبدیت کے بجائے استکبار کے مقام پر کھڑا کریں اور جن کی وجہ سے دلوں میں خدائی ہدایت کی تضحیک کا میلان پیدا ہو۔

### غرۃ الوثقی

اپنے محدود علم قرآن کی روشنی میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ سورہ لقمان کی آیت ۲۲ مرکزی اہمیت رکھتی ہے اور یہی روحِ کلام ہے۔ پڑھیے:

اور جس نے اللہ کی بارگاہ میں اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور وہ احسان کیش بن گیا تو بس اُس نے ایک مضبوط رشتے کو تھام لیا..... الخ

یہاں پھر 'حسن' کی شان سامنے آتی ہے۔ کوئی محض احسان کیش نہیں ہو سکتا اور زندگی کو 'حسن' و خوبی سے مالا مال نہیں کر سکتا جو اللہ کے وجود کی عظیم صداقت کو نہ تسلیم کرے اور اس کا حاکمانہ مقام پہچان کر اپنی باگ ڈور اس کے حوالے نہ کر دے۔ خدا سے یہ تعلق وہ مضبوط ترین رشتہ ہے جسے تھام لینے کے بعد زندگی تباہ کن ٹھوکروں سے بچ جاتی ہے، خیالات کی آوارگی و پریشانی، جذبات کی بے راہ روی اور اعمال کے بے ربطی کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کے اس مرکزی نکتے کے گرد فرد کی ساری قوتیں اور تمدن کی جملہ سرگرمیاں منظم و مرتب ہو جاتی ہیں اور نظم و ترتیب کے فقدان میں کوئی 'حسن' نہیں

ایک صحیح نظام تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ انسانیت کو اس عُرْوۃ الوثقیٰ تک لائے اور خدا پرستی کے رشتہ محکم کو تھامنے کی صلاحیت دے۔ اسلامی نظام تعلیم کی یہ اساسی ذمہ داری ہے کہ وہ بندوں کو خدا کے سامنے سر تسلیم پوری طرح خم کر دینا اور خم کیے رکھنا سکھائے۔ یہ حالت اس استکبار کی عین ضد ہے جو آیت ۶ میں بیان ہوا ہے۔

سورہ کی تمہید کے ساتھ مرکزی روح کلام کی آئینہ دار آیت کو ملا کر آپ دیکھ چکے۔ آئیے! اب اس مربوط ٹکڑے کو لیں جس میں چند اہم نکات تسلسل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس ٹکڑے میں حضرت لقمانؑ اپنے صاحب زادے کو۔ بلکہ یوں کہیے کہ نئی نسل کو۔ اساسیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہم ایک ایک نکتے کو الگ الگ لیتے ہیں۔

### فکر کا مسلک

حضرت لقمان کو جو حکمت اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور جس کے تحت وہ اپنے فرزند کو تلقین کرتے ہیں وہ ہے اِنْ اَشْكُرْ لِلّٰہِ (۱۲:۳۱)، یعنی خدا کا حق پہچانو، احسان شناسی کی روش اختیار کرو۔ اسلام نے خدا کا جو تصور دلایا ہے وہ بنیادی طور سے ایک رحیم، شفیق اور ودود، ہستی کا تصور ہے (رَحْمَتِنِیْ وَبَسَّعَتْ کُلُّ شَیْءٍ)۔ اس کا قہر و غضب اس کی صفتِ عدل کی وجہ سے ہے اور اس کی صفتِ عدل خود صفتِ رحمت ہی کی مظہر ہے۔ چنانچہ قرآن کا ایک بڑا حصہ یہی احساس دلانے کے لیے وقف ہے کہ انسان پر خدا کے احسانات و انعامات کس درجہ وسیع ہیں۔ احسان اور رحمت کا حق یہ ہے کہ شکر کا رویہ پیدا ہو۔ ہمارے دین میں تعلق باللہ کی اساس فی الحقیقت جذبہ شکر پر ہے۔ تقویٰ اور خشیت شکر کے ساتھ ایک لازمی پہلو کی حیثیت سے ہے۔ نعمت اور رحمت کا شعور جہاں شکر کا جذبہ ابھارتا ہے وہاں اس کے چھن جانے کا اندیشہ بیم و خشیت بھی پیدا کرتا ہے۔

بندوں کے شکر کی خدا کو کوئی احتیاج نہیں کہ اس کے بغیر اس کے کام اٹکے جاتے ہوں۔ خدا کے سامنے شکر کی روش اختیار کرنا خود ہمارے اپنے احسان کیش بننے اور

اپنی زندگی سنوارنے کے لیے ضروری ہے۔ جو شخص خدا کے اُن گنت احسانات سے استفادہ کر کے اس کی عنایات کا احساس نہیں کرتا۔ ایسا احسان فراموش زندگی کی صحیح تعمیر کے لیے پھر کوئی بنیاد بھی نہیں پاسکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ وَمَنْ يَشْكُرْ فَلَا تَمُوتُ بِشَيْءٍ مِنْهُ (۱۲:۳۱)، جو کوئی خدا کا حق پہچانے گا اس کا یہ رویہ احسان شناسی خود اسی کی ذات کے لیے نفع بخش ہے۔ یہ بہر حال محسن بننے کے لیے نقطہ آغاز جذبہ شکر ہے۔ شکر کی روش کی ضد کفر ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی شکر کی راہ کو چھوڑ کر کفر کی روش اختیار کرے تو اس کا وبال بھی خود اسی کو بھگتنا ہے، اللہ تو غنی و حمید ہے اور اسے نہ کسی کے شکر کی احتیاج ہے، نہ کسی کے کفر سے کوئی اندیشہ۔

معلوم ہوا کہ اسلامی نظام تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ ایک ایک فرد کو یہ پیغام دے کہ اِنْ اَشْكُرْ لِلّٰهِ خُدا کا حق پہچانو اور احسان شناسی کی روش اختیار کرو۔

### انعاماتِ الہی کا شعور

شکر کا جذبہ انعامات، احسانات اور عنایات کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں یہ شعور دلانے کا اہتمام بھی ہے۔ دعوت دی گئی ہے کہ بے شمار ظاہری اور باطنی نعمتیں تقاضا کرتی ہیں کہ ان پر غور و فکر کرو، فرمایا:

اس نے زمین و آسمان کو ستونوں کے بغیر کھڑا کیا جیسے کہ تم دیکھتے ہو اور زمین پر ایسے بوجھ جمادیے کہ تمہیں لیے ہوئے (اپنی گردش میں) کسی طرف ڈھلک نہ جائے اور اس میں سب طرح کے جانور پھیلا دیے اور آسمان سے بارش برسانے کا نظم مقرر کیا اور پھر اس کے ذریعے سے نباتات کے نہایت ہی خوب خوب جوڑے ہر طرح کے اگائے۔ (۱۰:۳۱)

کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ سب کچھ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، اسے اللہ نے نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور تم پر ظاہری اور باطنی

نعمتوں کی بوجھار کردی ہے۔ (۲۰:۳۱) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ خدا تعالیٰ رات کو دن میں سے اور دن کو رات میں سے پرو کر نکالتا ہے..... الخ (۲۹:۳۱)

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ سمندر میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ کشتی چلتی ہے (۳۱:۳۱)..... اور جب اس کے مسافروں کے سروں پر کوئی لہر لکھ ابر کی طرح چھا جاتی ہے تو (مصیبت میں گھر کر) وہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ اس کے لیے جذبہ عبودیت کو خالص کر کے!..... (۳۲:۳۱)

یعنی چاروں طرف سے خدا کی نعمتیں اُمدی پڑ رہی ہیں۔ ایک وسیع خوان بچھ رہا ہے۔ قدرت کے اس ماحول میں ایک حقیقت پسند اور حق شناس انسان کے اندر لازماً جذبہ شکر ابھرنا چاہیے۔ نظام تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس ماحول سے اس طرح طلبہ کو روشناس کرائے کہ انھیں خدا کے احسانات و انعامات کا شعور حاصل ہو اور عبدیت کے احساس کے ساتھ ان میں شکر کا جذبہ ابھرے۔ ہمیں سائنس، جغرافیہ، تاریخ، ہیئت اور دوسرے تمام مادی و طبعی علوم کی تعلیم اس طرح دینی چاہیے کہ خدا پرستانہ شعور اس میں سودیا گیا ہو۔ ہر تجربہ، مشاہدہ، انکشاف، ایجاد و اختراع اور عملِ تسخیر ہمارے اندر خدا کے شکر کی اُکساہٹ پیدا کرے۔ حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ سواری پر بیٹھتے تو جذبہ شکر کے ساتھ خدا کی حمد کرتے اور اور اپنے عجز کا اقرار! (سبحن الذی سخر لنا هذا.....) ٹھیک اسی طرح ہمارے سائنس دان جب کسی رازِ فطرت کو سمجھ لیں، ہمارے موجد جب کوئی چیز ایجاد کریں، ہمارے کاریگر جب کسی مشین سے کام لیں اور ہمارے سپاہی جب کسی اسلحہ کو ہاتھ میں لیں تو ان کی رُوحیں سبحن الذی سخر لنا هذا وما کنا له مقرنین پکارا انھیں۔ اسی خدا پرستانہ جذبہ شکر کے فقدان نے مغربی تمدن کو مادہ پرستی میں اتنا بہکا دیا ہے کہ قدرت کے عطیاتِ رحمت ہونے کے بجائے عذاب بن گئے ہیں۔ ہمارے نظام تعلیم کو اس اندھی مادہ پرستی سے انسانیت کو بچانا ہے۔

لوگوں نے اس طرح کی آیات سے عموماً یہ بات ثابت کرنے کی کوشش تو کی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے مگر ہمارے جدید طبقے نے یہ کاوش نہیں کی کہ وہ کس اسپرٹ کے ساتھ اور کس نقطہ نظر کے ساتھ علوم کی تحصیل و اشاعت چاہتا ہے۔ قرآن کا اولین منشا یہ ہے کہ خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت، اس کے احسانات و عنایات کا شعور اور جذبہ شکر و سپاس کا سرمایہ، مطالعہٴ انفس و آفاق سے حاصل کیا جائے اور کسی بھی علم کے دائرے میں کوئی قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایمان باللہ کو مشعلِ راہ کی حیثیت دینی چاہیے۔ ورنہ تمام علوم غلط رخ پر ڈھل جائیں گے اور ان سے جو عمل پیدا ہوگا وہ بھی فاسد ہوگا۔

اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان کو اور ان کی بے شمار ہم مقصد آیات کو آپ دیکھیے، ان سب کا منشا یہ شعور دلانا ہے کہ یہ کائنات اگر کوئی نظم رکھتی ہے، اس کے عناصر اگر تمہارے لیے سازگاری رکھتے ہیں، اس کے قوانین اگر تمہارے لیے تسخیر کی راہیں کھولتے ہیں تو یہ نظامِ فطرت یوں ہی از خود ایسے نہیں بن گیا۔ کسی بنانے والے نے حکمت کے ساتھ اسے ایسا بنایا ہے اور تمہیں پیش نظر رکھا ہے۔ ہمارے علوم کو بھی اسی شعور کی راہ پر جانا چاہیے اور ہمارے نظامِ تعلیم کو بھی یہی مقصد سامنے رکھنا چاہیے۔

اس نکتہٴ معنی کو ہم آیت ۳۲ میں بہت ہی واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں انسان کو اس عالمِ نفسیات سے ایک کیفیت پیش کر کے عبرت دلائی گئی ہے۔ انسان جہاں اس کائنات کی وسیع نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، وہاں اس کی مہیب قوتوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس بھی پاتا ہے۔ یہ بے بسی اسے ایک ایسے روحانی سہارے کا محتاج بناتی ہے جو تدابیر کی بازی ہارنے کے بعد بھی قائم رہے۔ سمندر کی موجیں بھی ایک ایسی قوت ہیں کہ جب کبھی انسان ان کی زد پر آتا ہے تو سارے سہارے کھو بیٹھنے کے بعد خدا کی طرف بڑے سچے والہانہ جذبے سے رجوع کرتا ہے۔ آج بھی جب جہاز تباہی کے طوفان میں گھر جاتے ہیں تو جدید الحاد پسند انسان بھی خدا کو یاد کرتا ہے اور بار بار خدا اپنے بے بس بندوں کی دکھ بھری فریاد سن کر ان کو بچا نکالتا ہے۔ لیکن بچ نکلنے کے بعد کم ہی



ہیں جو راہِ حق پر ”مقصد“ بن کے چلتے رہیں، بقیہ پھر تجوّد میں پڑ جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ علم انفس کا ایک باب ہے مگر اپنی ایک خاص غایت کے ساتھ۔ اسی غایت کو سامنے رکھ کر نفسیات کا علم مدوّن کرنے کی، نفسیات کا تعلیمی نقشہ بنانے کی اور نفسیات کا نصاب ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس غایتِ عبرت اندوزی اور خدا شناسی کو مقصود بنائے بغیر نفسیات کا علم مدوّن کرنا یا اس کا سلسلہ تعلیم و تعلّم جاری رکھنا اسلامی نقطہ سے قطعاً بے سود بلکہ اُلٹا مضر ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کی اولین غایت خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت دینا ہے۔ وہ خدا جس کا مقام یہ ہے کہ:

..... اللہ ہی ہے جو قیامت (کی گھڑی) کا علم رکھتا ہے..... وہی ہے

جو مینہ برساتا ہے..... وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ رحموں کے پردے

میں کیا کچھ ہے (۳۴:۳۱)۔ اور اس کے بالمقابل انسان..... عقل

کے اس پتلے..... کا حال یہ ہے کہ:

..... کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل وہ کیا کرے گی..... کسی جان کو نہیں

معلوم کہ وہ زمین کے کس حصے میں دم توڑے گی۔ (۳۴:۳۱)

کائنات اور زندگی کے سارے احوال کا مکمل علم صرف اللہ کو ہے۔

ان اللہ علیم خبیر۔ (۳۴:۳۱)

یہ ہے وہ مزاج جس سے ہمارے نظامِ تعلیم کو آراستہ ہونا چاہیے۔ اس نقطہ نظر سے معلومات مرتب ہونی چاہئیں اور پھر بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہونی چاہئیں۔

کلماتِ الہی کا فہم

اسی سورت میں آتا ہے کہ اگر زمین کے سارے کے سارے درختوں سے بے شمار قلم بنا لیے جائیں اور ساتوں سمندر روشنائی میں بدل جائیں اور لکھنے کے اس سامان کے ساتھ ’کلمات اللہ‘ یعنی خدا کی نعمتوں، اس کی قدرتوں، اس کی آیتوں، قوانین و

نوامیس، اس کے احکام اور فیصلوں، اس کی مخلوقات کے احوال کو قلم بند کیا جانے لگے تو روشنائی کے سمندر ختم ہو جائیں گے اور قلم گھس گھس کر نابود ہو جائیں گے مگر خدا کے کلمات احاطہ تحریر میں نہ آ سکیں گے۔ ذکر تو اس کے مقامِ عظمت، اس کی قدرت کی لامحدود وسعتوں اور اس کی بے پایاں تخلیقات کا ہے۔ لیکن ایک واضح اشارہ یہ ہے کہ اصل کاوش کا میدان انسان کے لیے یہی ہے کہ وہ کلماتِ الہی سے اپنا دامنِ علم و ایمان بھرتا رہے۔ افراد اور قومیں اور نسلیں اپنی محنتیں اس مقصد پر کھپاتی چلی جائیں۔ ع

کیا اور جہاں میں رکھا ہے اُس جانِ جہاں کی بات کریں

اسلامی نظامِ تعلیم کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زیرِ اثر ذہنوں میں تحریک پیدا کرے کہ وہ مطالعہ آفاق و انفس کریں تو اس مقصد سے کریں کہ کلماتِ الہی کی جستجو کرنی ہے، ان کو سمجھنا ہے اور ان سے روشنی اور قوت حاصل کرنی ہے۔

### خشیت

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شکر دین کا اگر ایک پہلو ہے تو دوسرا لازمی پہلو خشیت ہے۔ احسان کی قدر از خود احسان کے چھن جانے کا اندیشہ پیدا کرتی ہے۔ سو جہاں خدا کی رحمت کے لیے تمنائے بے تاب موجود رہتی چاہیے وہاں رحمت سے محرومی کی فکر بھی کار فرما ہونی چاہیے۔ آدمی رحمتِ الہی کے نشے میں پڑ کر بعض اوقات اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے اور جب یکا یک قہر کی بدلیاں چمکتی دیکھتا ہے تو حواس کھو بیٹھتا ہے۔ واذا انعمنا علی الإنسان اعرض ونآ بجانبہ واذا مسہ الشر کان یبوس۔ (بنی اسرائیل: ۷۷-۷۸) پس خشیت کا جذبہ ایک پاسبانِ جذبہ ہے اور یہ آدمی کو محتاط اور چوکنا رکھتا ہے۔ اسے برسرِ عمل لانے کے لیے آخرت کے محاسبے کا تصور دلا یا گیا ہے۔ سورہ لقمان میں انتباہ دیا گیا ہے کہ:

معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہوگا۔ (۲۴:۳۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اندیشہ رکھو اس دن کا جس دن نہ

کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے لیے کچھ مفید ہو سکے گا۔ یقیناً خدا کا وعدہ سچا ہے، سو تم کو دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور تم کو اللہ کے بارے میں وہ دغا باز (شیطان) کسی فریب میں مبتلا نہ کر دے۔ (۳۱:۳۳)

بہت سے مغالطے صاف کرنے کے لیے یہ بھی جتا دیا کہ لکھو کھا انسانوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں خدا کو کوئی مشکل درپیش نہیں ہے:

تم سب کو بنانا اور تم سب کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بس ویسا ہی ہے جیسے ایک فرد کا (۳۱:۲۸)

اور حضرت لقمان بھی اپنے فرزند کو خدا کی مضبوط گرفت سے یوں آگاہ کرتے ہیں کہ:

اے میرے بیٹے! اگر رائی برابر بھی کوئی چیز کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں (کہیں) ہو تو اللہ (جب چاہے) اسے لا حاضر کرے۔ (۳۱:۱۶)

اسلامی زندگی خدا کے محاسبے اور خدا کی گرفت کا خوف رکھے بغیر نہیں بنتی۔ اسلام کا انسان مطلوب وہی ہے جو محاسبہ آخرت کو ذہن میں رکھ کر سوچتا، زبان کھولتا اور عملی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ وقتی مفادات کے بجائے، خدا کی رضا جیسا اونچا منہا سامنے رکھتا ہے۔

اسلامی نظام تعلیم پر بھی واجب آتا ہے کہ وہ اس خشیت سے دلوں کو آراستہ کرے، محاسبہ آخرت کا احساس تازہ کرے اور رضائے الہی پر نگاہوں کو مرکوز کرادے۔ حکمت اور نیکی کے لیے یہ خشیت ایک لازمی بنیاد ہے۔

توحید

خدا کے احسانات کے جواب میں شکر اور احسان شناسی کا رویہ صرف توحید کو

تسلیم کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر خدا کے عطیات سے استفادہ کر کے احساسِ شکر پورے کا پورا اس کے حضور پیش کرنے کے بجائے کچھ دوسری مفروضہ ہستیوں پر تقسیم کر دیا جائے تو جس کا حق واجب تھا اس کا حق تو ادا نہ ہوا اور جن کا حق کچھ بھی نہ تھا ان تک بے جا طور پر جا پہنچا۔ حضرت لقمان اپنے فرزند کو تعلیم دیتے ہیں کہ لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم (۱۳:۳۱) ظلم کہتے ہیں حق ماری کو۔ یہ خدا کی حق ماری ہے اور اس لیے بہت بڑی حق ماری ہے کہ اس کا کھا کر گن دوسروں کے گائے جائیں۔

پس اسلامی نظامِ تعلیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئی نسلوں کو توحید پر جمادے اور ان کو اس سے روکے کہ وہ ذات میں، صفات میں، حقوق میں یا حاکمانہ اقتدار میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کریں۔

خدا کا کُلّی انکار بہ حیثیتِ مجموعی انسانیت نے شاید کبھی بھی نہیں کیا، نہ آج کا انسان تصورِ خدا سے ذہن کو خالی کر سکا ہے۔ مصیبت یہی رہی ہے کہ کسی نہ کسی نوع کا شرکِ اولاد آدم کو لے ڈوبا ہے۔ کسی نے ذات میں شریک کیا، کسی نے صفات میں، کسی نے عبادات میں سے دوسروں کو حصہ دیا، کسی نے استعانت دوسری بارگاہوں سے کی اور کسی نے طاعت کے لیے دوسرے اقتدار سامنے رکھ لیے۔ اسلام نے عبادت، استعانت اور طاعت کے تینوں پہلوؤں سے انسان کو توحید پر جمایا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم بھی وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کو یہی درسِ توحید دے۔

### سماجی روابط کی درستی

خدا کے احسانات کے شعور سے جس دل میں شکر و سپاس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ انسانوں کے احسانات کا بھی بہترین قدردان ثابت ہوتا ہے اور انسانوں میں سب سے بڑھ کر احسان والدین کا ہے اور ان میں سے بھی والدہ کا احسان بہت بڑا ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان اپنے بچے کو دوسری نصیحت والدین سے حسنِ سلوک کی کرتے ہیں۔ وہ خدا کا مطالبہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

میرا شکر ادا کرو اور (میرے بعد) اپنے والدین کا بھی! (۱۴:۳۱)

سامی رابطوں میں دین حق نے والدین کو اولین مقام دیا ہے۔ خدا کے عظیم حق کے بعد جو شخص والدین کے حق کو بھی پہچان لیتا ہے، پھر وہ دوسرے تمام رابطوں کے حقوق کا احساس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے کردار میں یہ جذبہ احسان شناسی اس اصل الاصول کی حیثیت سے پیوست ہو جاتا ہے کہ مجھے ہر بھلائی کا جواب بھلائی سے دینا ہے۔ مجھے جس سے فائدہ اٹھانا ہے اس کو فائدہ پہنچانا بھی ہے جس سے میں کچھ لیتا ہوں اسے دینا بھی ہے۔ گھر، خاندان، معاشرہ اور اس کے ادارات، حکومت، قوم اور انسانیت کبھی سے آدمی کو بے شمار فائدے پہنچتے ہیں اور اگر وہ احسان شناس ہو تو وہ ہر استفادے کے جواب میں کوئی نہ کوئی خدمت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ والدین کا جس نے حق پہنچانا پھر وہ خاندان اور ذوی القربیٰ اور پڑوسیوں اور افسروں اور ماتحتوں، بلکہ جانوروں تک کے حقوق کا احساس کرنے لگتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تمام سامی روابط کی درستی کا دار و مدار والدین کا حق پہنچانے پر ہے۔

لیکن والدین کی طاعت و خدمت خدا کی عبادت و اطاعت سے نچلے مرتبے پر ہے۔ مقدم خدا کا حق ہے۔ خدا کا حق مار کر اگر والدین کا حق ادا کیا جائے تو شرک کی راہ کھل گئی۔ اس وجہ سے یہ وضاحت بھی کی گئی کہ وان جاهد اک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعهما (۱۵:۳۱)، یعنی اگر والدین تم کو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کے لیے مجبور کریں جو تمہارے علم و ایمان میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان کی غلط بات کی اطاعت نہ کرو۔

یعنی والدین کی اطاعت اصولاً انسانی تعلقات کے تمدنی دائرے میں خدا کی اطاعت کی حدود کے اندر کی جاسکتی ہے۔ ان حدود کو توڑ کر نہیں۔ جو اطاعت سب سے بڑی اطاعت کی حدود کو پھاندنا چاہے وہ ترک کر دی جائے گی۔ والدین کے کہنے سے شرک کی روش اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ان کے ایسے حکم سے انکار لازم ہے۔ البتہ اس حالت میں بھی ان کا پاس ادب رہے گا۔ چاہا گیا ہے کہ وصاحبہما فی الدنیا معروفاً۔ یعنی

اس اصولی اختلاف کے باوجود ان سے دنیوی تعلقات خوش اسلوبی سے نبھاؤ۔ یہاں سے ضمناً یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ سماجی رابطے۔ حکمران سے، والدین اور اقربا سے، کاروباری شرکا سے، دفتری افسروں سے۔ ایمان و مسلک کے شدید اور واضح اختلافات کے باوجود خوش اسلوبی سے نبھائے جاسکتے ہیں۔ اور ان رابطوں کا قائم رہنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ دعوت حق پہنچانے کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔

ساتھ ہی پھرتا کید کہ ”وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنْبَأَ الْيَوْمَ (۱۵:۳۱)۔ زندگی میں پیروی کرو تو صرف ایسے ہی رہنماؤں کی جو خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والے ہوں۔ زندگی کے اصول و اقدار انہی سے لو۔ یہاں اشارہ یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرے میں سیاسی اور فنی قیادت کے مناصب ایسے افراد کو سونپے جائیں جن کی زندگیاں رجوع الی اللہ کی آئینہ دار ہوں۔ گویا معیار انتخاب بھی معین ہو گیا۔ علاوہ ازیں یہ اشارہ بھی یہاں سے اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں درس گاہوں کے معلمین بھی ایسے ہی لینے چاہئیں جو رجوع الی اللہ کی صفت سے متصف ہوں، کیوں کہ طلبہ ان کے اتباع میں چلیں گے۔

اس ہدایت کی روشنی میں ایک اسلامی نظام تعلیم کو ان امور کی تربیت دینی

چاہیے:

\_\_\_ خدا کی اطاعت کے تحت سب سے بڑھ کر والدین کی اطاعت، اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے تمام روابط کے حقوق کو پورا کرنا۔

\_\_\_ خدا کی اطاعت سے اگر والدین یا کسی دوسرے کا حکم ٹکرائے تو اسے قبول کرنے سے انکار کرنا۔

\_\_\_ اعتقاد و مسلک کے اختلاف کے باوجود جائز دنیوی معاملات کی حد تک سماجی رابطوں کو نبھانا۔

\_\_\_ زندگی کے سفر میں صرف ایسے عناصر کی رہنمائی قبول کرنا جو خدا کی طرف رجوع دلانے والے ہوں۔

ان نکات پر ہماری سوکس (Civics) کی ترتیب ہونی چاہیے۔

## امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

حضرت نعمان مزید فرماتے ہیں کہ اے بیٹے! نماز قائم کرو، معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور (اس جدوجہد میں) جو کچھ بھی پیش آئے اسے حوصلہ مندی سے برداشت کرو! (۱۷:۳۱)

آخر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔ درحقیقت دین کا بہت ہی بڑا تقاضا یہ ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔ اسلام اپنے انسان مطلوب کو اس مقصد کے لیے اٹھانا چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے پورے دائرے میں منکر کا سد باب کرے اور معروف کا سکہ چلانے کی جدوجہد کرے۔ اسے نیکی کا نظام قائم کرنا ہے اور بدی کی جڑ کاٹنی ہے۔ وہ حق کا سپاہی ہے اور باطل کے خلاف جہاد میں اسے ساری قوتیں کھپانی ہیں۔ خیالات، نظریات، اخلاق، رسوم، قانون، معاشیات، کاروبار، سیاست، بین الاقوامی مسائل کے بے شمار دائرے ہیں جہاں جہاں بھی اسے قانون الہی اور فطرت انسانی اور عقل سلیم کے خلاف کوئی منکر دکھائی دے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے ختم کرنے اور لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔ دوسرے طرف قانون الہی، بے آمیز فطرت انسانی اور عقل سلیم جن امور کا تقاضا کرتی ہے ان کو نافذ کرنے کے لیے زور لگائے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام اور ماحول میں تبدیلی لائے، انقلاب پیدا کرے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی تبدیلی تکلیف اٹھائے بغیر اور قربانیاں دیے بغیر اور مزاحمتوں کا سامنا کیے بغیر نہیں لائی جاسکتی۔ بدی کا زور توڑنے اور نیکی کا راج قائم کرنے کے لیے جو جہاد لازم آتا ہے وہ کوئی کھیل تو ہے نہیں۔ اس لیے اغتباہ دیا گیا ہے کہ اس مہم میں جو کچھ مزاحمتیں اور مصیبتیں پیش آئیں ان کو حوصلے سے سہارو۔

ذلک من عزم المؤمن کہہ کر توجہ دلائی کہ یہ ہے بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام، یہ ہے عظیم الشان معرکہ جس کے لیے بازیاں لگائی جانی چاہئیں۔ یہ ہے نصب العین جس کے لیے جانیں لڑانا مردوں کے شایان شان ہو سکتا ہے۔ نوکری اور

کاروبار اور عہدے اور ادنیٰ ادنیٰ خواہشات پر مرتے رہنا اہل دل کا کام نہیں۔  
نماز قائم کرنے کی تلقین یہاں یوں مناسب تھی کہ خدا سے شکر کا تعلق قائم رکھنا تو  
اس کے بغیر ممکن ہے ہی نہیں، لیکن آگے جو مرد آئین مہم سوچنی جا رہی ہے اس کا ایک ایک  
قدم اٹھانے کے لیے نماز سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ نماز ہی خدا سے تعلق کا ذریعہ ہے  
اور نماز ہی انسانی دائرے میں ادائے فرض کے لیے ضروری ہے۔ نماز خدا کے حضور شکر کا  
اظہار ہے اور بندوں کے مقابلے میں صبر آموز اور ہمت افزا۔

اب یہ بات خود ہی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی تعلیم کو کیا نصب العین سامنے رکھنا  
چاہیے اور کس مقصد کے لیے نئی نسلوں کو تیار کرنا چاہیے۔ صحیح تعلیم وہ ہے جو ایک طرف  
بجائے خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، معروف و منکر کا فہم دلائے اور معروف کو  
قائم کرنے اور منکر سے روکنے کے لیے جہاد کا انقلابی جذبہ ودیعت کرے۔ پھر ہماری تعلیم  
گاہوں میں تربیت کا ایسا ماحول ہونا چاہیے جو طلبہ کو اقامتِ صلوٰۃ پر آمادہ کر سکے۔ وہ ان کو  
صبر و ہمت اور حوصلہ و عزم سے آراستہ کر کے نکالے۔

## روشِ کبر سے اجتناب

خدا کے لیے جذبہ شکر عبودیت کی جس راہ پر لے جاتا ہے اس میں کبر و رعونت کا  
کوئی مقام نہیں آ سکتا۔ مسلکِ شکر اور مسلکِ کبر میں کامل منافات ہے۔ حضرت لقمان  
اپنے بچے کو تاکید کرتے ہیں کہ:

”لوگوں کے مقابلے پر اپنے گال نہ پھلاؤ اور زمین میں گھمنڈ کی چال

نہ چلو۔ خدا کسی شنی باز، غلط کار کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۸:۳۱)

خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوسرے انسانوں کے لیے مساویانہ مرتبے کا  
احساس کرے کیوں کہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق اور ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔  
دوسروں کے مقابلے میں فخر و غرور، اکڑفوں اور ان کی تحقیر کے لیے اسلامی زندگی میں  
مجبائش نہیں۔ جس شخص میں رتی بھر بھی کبر ہوگا وہ اخروی کامرانی حاصل نہ کر سکے گا اور نہ



وہ اس ارضی زندگی میں احسان کیش بن کر حیاتِ طیبہ سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ غرورِ مال، غرورِ حسن، غرورِ صحت، غرورِ نسل، غرورِ وطن، غرورِ آبا، غرورِ اولاد، غرورِ علم اور غرورِ اقتدار کے تمام دروازے یہاں بند ہیں۔ نہ انفرادی کبر کی رخصت ہے، نہ طبقاتی اور نہ جماعتی فخر کی۔

انسانی معاشرے کے فساد کی شاید سب سے وسیع الاثر بنیاد یہی ہے کہ کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی نسل، کوئی طبقہ یا کوئی جتھا اپنے متعلق یہ سوچتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور دوسرے چھوٹے ہیں۔ میرے حقوق زیادہ ہیں، میرے مفادات اہم تر ہیں اور مجھے ترجیح حاصل ہے۔ پھر جس کا داؤ چل جاتا ہے وہ اقتدار، قانون، روایات، معاشی تسلط، ذہنی تفوق، طبقاتی بالادستی کے زور سے زندگی کے توازن کو غارت کر دیتا ہے۔ جواباً دوسروں میں بھی ایسا ہی مقام حاصل کرنے کے لیے بے چینی پیدا ہوتی ہے اور پھر رستہ کشی ہونے لگتی ہے۔

کبر ہی کے تحت ماضی کے کچھ سر پھرے انسانوں نے خدائی کے دعوے کیے۔ کبر ہی کے تحت چنگیزوں اور ہلاکوؤں نے مدنیت کو پیروں تلے روندنا، کبر ہی کے تحت ہٹلر اور موسولینی کی آمریت اُبھری اور کبر ہی کے تحت آدمی آدمیوں کے خلاف گھناؤنے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام انسانوں کے لیے مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور ہماری درس گاہوں کو بھی طلبہ کے اندر یہی روح پھونکنی چاہیے۔ نظامِ تعلیم نئی نسلوں کو تلقین کرے کہ وہ انسانیت کے سامنے گال پھلائے اور تیوری چڑھائے ہوئے نہ آئیں اور زمین پر متکبرانہ روش کے ساتھ زندگی نہ گزاریں۔ ان کو محتمل کُجور نہیں بننا چاہیے۔

## علمِ حق کی مشعل

اس سورۃ تعلیمات میں ایک بیش قیمت نکتہ یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ آدمی کو جادۂ ہستی پر ہر قدم علم۔ یعنی علمِ حق۔ کی روشنی میں بڑھانا چاہیے۔ جہالت کی اندھیاریوں میں

کوئی قدم نہ رکھنا چاہیے۔

آیت چھ میں اس فاسد کردار کو بیان کیا جو لھو المحدث کے ذریعے مسافر ان حیات کو اللہ کے راستے سے بھٹکاتا ہے اور یہ کارنامہ وہ بغیر علم سرانجام دیتا ہے۔

آیت ۱۵ میں حضرت لقمان کی نصیحت میں شرک سے منع کرتے ہوئے مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ کے الفاظ آئے ہیں یعنی جب تک تمہیں واضح طور پر علم نہ ہو کہ خدا کا کوئی ساجھی ہے۔ تم نے دیکھا ہو یا دلیل قطعی سے جانا ہو، الہامی رہنمائی سے معلوم کیا ہو۔ تو تمہارا یہ کام نہیں کہ محض والدین کے کہنے یا کسی اور کے زور ڈالنے سے ایک نامعلوم بات کو واقعہ تسلیم کر لو۔

آیت ۲۰ میں ایک فاسد کردار کا ذکر ہے جو اللہ کے بارے میں اور اس کے دین کے بارے میں بغیر کسی علم کے بحثی کرتے ہیں۔ مختلف دعوے پیش کرتے ہیں، حقیقتوں کی تردید کرتے ہیں۔ ان کو کوئی یقینی ہدایت حاصل نہیں ہوتی اور ان کے پاس کسی ثابت شدہ اور غیر منحرف الہامی نوشتے کی سند نہیں ہوتی۔ علم کے بغیر جو لوگ ٹانک ٹوئیاں مارنے کے عادی ہو جاتے ہیں، ان کو جب اللہ کے نازل کردہ ہدایت نامے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس بنیاد پر اسے قبول نہیں کرتے کہ ہم تو اسی روش پر چلیں گے جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آئے ہیں۔ ان کی اس جاہلانہ ذہنیت کو خود ان پر نمایاں کرنے کے لیے یہ استفہامی اشارہ فرما دیا کہ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۳۱:۳۱)۔ یعنی یہ بھی سوچا ہوتا کہ کیا ہوگا نتیجہ اگر تمہارے باپ دادا کو یا خود تم کو شیطان جہنم کے عذاب کی طرف لیے جارہا ہو۔

ان آیات کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئی نسلوں کو واضح قسم کے علم حقائق۔ جو ثابت شدہ الہامی ہدایت پر مبنی ہو یا مشاہدے و تجربے کا یقینی ماحصل!۔ کی روشنی میں سوچنے اور کلام کرنے اور عملی روش اختیار کرنے کی تربیت دے۔ عالم افکار ہو یا عالم کردار، ہمارے نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ضمیر، انسان کو علم کی روشنی کے بغیر ظن و تخمین کے اندھیروں میں گامزن نہ ہونے دیں۔ اندھی آبا پرستی اور

قوم پرستی اور ہر قسم کی 'پرستی' اور جھوٹے تعصبات سے طلبہ کو بچایا جائے۔ وہ بڑی بڑی قوموں، جابر و ظالم حکمرانوں اور غلط ماحول سے متاثر ہو کر حقائق کی راہ سے ہٹ کر کچے قیاسات اور ادھورے نظریات کے سامنے مرعوبانہ اور مقلدانہ شان سے سرخم نہ کریں۔ ان پر حقائق اور نظریات کا فرق واضح ہونا چاہیے۔ وہ قائل ہو جائیں کہ قیاسی نظریات پر اخلاق، کردار اور تمدن کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جاسکتی۔

### تہذیب و شائستگی

اوپر کے وسیع نکات حکمت کے ساتھ ساتھ حضرت لقمان اپنے فرزند کو مہذب، صاف ستھرے اور سلیقہ مندانہ اطوار اختیار کرنے کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ وہ سکھاتے ہیں کہ:

میانہ روی کی چال چلو، اپنی آواز کو دھیمارکھو، کیوں کہ گدھے کی

آواز بہت بُری آواز ہے۔ (۱۹:۳۱)

یعنی چلو تو بہت بادقار طریقے سے چلو۔ نہ یوں کہ آدمی گھبرایا ہوا بھاگ رہا ہو، اور نہ یوں کہ مریل طریق پر چل رہا ہو۔ ویسے **وَاقْصِدْ فِی مَشِیْکَ** کا ایک جامع مطلب یہ ہے کہ ہر معاملے میں اعتدال کا رنگ پیدا کرو۔ بولو تو دھیمی آواز سے بولو۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے سے آدمی جانوروں سے مشابہت اختیار کرتا ہے۔ مزید تفصیلات قرآن میں بھی اور حدیث میں بھی بڑے پیمانے پر مذکور ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اسلامی زندگی چال ڈھال، گفتار و رفتار، کھان پین (کھانے پینے) جیسے امور میں اعتدال اور وقار اور سلیقہ و شائستگی کی تقاضی ہے۔ سو ہمارے نظام تعلیم کو یہ غایت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ وہ اچھے آداب و اطوار سے طلبہ کی روزمرہ زندگی کو آراستہ کرے۔ ان کو میانہ روی سکھائے اور انتہا پسندی سے روکے۔

میں نے سورہ لقمان کو جس طرح سے سمجھا ہے اجمالاً مطالعے کا حاصل پیش کر دیا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سورہ کے نکات اسلامی نظام تعلیم کی بنیادوں، اصولوں اور

مقاصد کو بخوبی معین کر دیتے ہیں۔ ان نکات کی شرح و تفصیل کے لیے نہ صرف پورے قرآن سے استفادہ کرنا لازم ہے بلکہ حضورؐ نے عملاً ایک نظام تعلیم و تربیت چلا کر قرآن کی جو شرح پیش فرمائی ہے نیز زبان مبارک سے حکمت قرآنی کو جس طرح واضح کیا ہے۔ اس سارے کارنامے کی مدد لے کر ہی ہم کسی تعلیمی خاکے میں صحیح رنگ بھر سکتے ہیں مگر بنیادی خاکہ ہمیں سورہ لقمان میں یک جا ملتا ہے۔

خدا کرے یہ کاوش مٹی بر ہدایت ہو، پڑھنے والوں کے لیے باعثِ افتادہ ہو، اللہ کے کچھ بندوں کے سینوں میں اسلامی نظام تعلیم کو عملاً پوری طرح کارفرما کرنے کا جذبہ بیدار ہو اور لکھنے والے کے لیے ذریعہ مغفرت ٹھہرے۔ (آمین)

(بشکریہ: ترجمان القرآن، لاہور، مئی ۲۰۰۶ء)

